مُتوازی سائے

اوم پرکاش

آزاد بہاولپوری
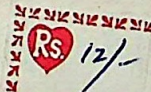
سالِ اشاعت :- ۱۹۸۰ء

تعدادِ اشاعت :- پانچ سو

ناشر :- ماہنامہ شانِ ہند دہلی

طباعت :- خواجہ پریس دہلی

کتابت :- محمد احسن بجنوری

قیمت فی جلد :- Rs. 12/-

ملنے کا پتہ

۱- مکتبہ شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۲ انصاری مارکیٹ
دریا گنج، دہلی ۲

۲- سبھاش کمار، "پرکاش نواس" ۹۸، آریہ نگر
غازی آباد - یو-پی

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۔	کچھ اپنے بارے میں	۷
۲۔	پیش لفظ	۱۳
۳۔	دو بچیاں ۲ دو سہیلیاں	۲۲
۴۔	طفلِ بے مکتب	۲۵
۵۔	اُف یہ شاعر	۲۷
۶۔	ترے خیال سے دنیا مری حسیں ہے ابھی	۳۱
۷۔	بسنت	۳۳
۸۔	شریکِ حیات سے	۳۷
۹۔	نعم البدل	۳۹
۱۰۔	نیا سال	۴۰
۱۱۔	فرشتے	۴۱
۱۲	میرا	۴۶
۱۳۔	الموڑہ والوں سے	〃
۱۴۔	نمائش	۴۷
۱۵۔	بہاریں پھر بھی آئیں گی	۵۲
۱۶۔	عظمتِ آدم	۵۴
۱۷۔	ہمارے عزم کا سورج	۵۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۸ -	انتباہ	۵۹
۱۹ -	غزلیں	۶۲ تا ۷۶
	تراجم	
۲۰	شہید فیوچیک	۷۹
۲۱ -	نغمۂ شہنائی	۸۲
۲۲ -	ایک سوویت نغمہ	۸۴
۲۳ -	آؤ ہم انجمن سے اٹھ جائیں	۸۷
۲۴ -	خراج	۹۰
۲۵ -	بیداری	۹۳
۲۶ -	انتظار	۹۵
۲۷ -	کارواں حسینوں کے	۹۷
۲۸ -	مکتوب شملہ سے واپسی پر	۱۰۰
۲۹ -	وہ تم نہیں تھیں	۱۰۲
۳۰ -	وہ زمانہ	۱۰۵
۳۱ -	احساسِ تنہائی	۱۰۸
۳۲ -	سنگریزے	۱۱۰ تا ۱۱۷
۳۳	متفرقات	۱۱۸
۳۴	غمِ رفیع	۱۲۰

انتساب

اُن کرداروں کے نام :

جنھوں نے میرے ذہنی احساس و عمل کو متاثر کیا

اور میری ادبی تخلیقات میں نمایاں ہو گئے۔

— آزاد بہاولپوری

کچھ اپنے بارے میں

اپنے بارے میں کچھ لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی اور کے بارے میں لکھنا آسان ہے۔ لہٰذا چند بے ربط جملوں کے ذریعہ اپنا تعارف دے رہا ہوں۔

میرے بزرگ بہاولپور (اب پاکستان میں) میں کب اور کہاں سے آئے، مجھے معلوم نہیں۔ گھر کی گفتگو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ بہاول پور کے پاس دریائے ستلج کے پار ایک گاؤں آدم واہن سے اُٹھ کر بہاول پور میں آباد ہوئے تھے، لیکن ۱۹۶۵ء میں جودھپور آکر یہاں کی مقامی طرز زندگی، زبان، تہذیب و تمدن کا بغور مطالعہ کر کے میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ اغلباً ہمارے آباؤ اجداد راجپوتانہ

سے ہجرت کر کے ریگستان کی منزلیں طے کر کے بہاول پور پہنچے تھے۔
میرے پردادا کا نام لالہ لکھی رام داروغہ، دادا کا نام لالہ چانن داس حکیم
اور والد صاحب کا نام جناب سکھ دیال (۱۸۹۷-۵-۱۴ تا ۱۹۷۹-۱-
۲۴) تھا۔ محلہ ٹھٹھیاراں، کچھی بازار میں ہمارا جدی مکان تھا جو تقسیم ہند ۱۹۴۷ء
کے بعد ہمیں چھوڑنا پڑا۔

میری پیدائش بہاول پور کی ہے۔ تاریخ پیدائش چرچ مشن اسکول بہاولپور
کے ہیڈ ماسٹر جناب لاازرس صاحب کی عطا کردہ ہے۔ والدین کو میری تاریخ
پیدائش یاد نہ تھی۔ اُن دنوں ۱۱ر نومبر ایک تاریخی اور مقدس دن مانا جاتا تھا.
جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تھی۔ لہذا ۱۱ر نومبر ۱۹۲۶ء میری تاریخ پیدائش مقرر
ہوئی اور اسکول میں داخلہ ملا۔ تعلیم کے کچھ مراحل بہاولپور میں، کچھ غازی آباد
اور کچھ دہلی میں طے کیے۔ مڈل کا امتحان چرچ مشن اسکول بہاولپور سے [illegible]ء میں، میٹرک کا امتحان صادق ڈین ہائی اسکول
سے جب جناب چمن لال بھاٹیہ ہیڈ ماسٹر تھے ۱۹۴۲ء میں، ادیب فاضل کا امتحان ۱۹۵۶ء میں، اور
بی اے کا امتحان لاہور کالج دہلی سے ۱۹۵۸ء میں پاس کیا۔ بہاول پور کا زمانۂ تعلیم
ایک سنہری دور تھا جس میں طلبا کو صرف ایک دُھن ہوا کرتی تھی، حصولِ تعلیم کی دُھن دوسرے
لڑکوں سے آگے بڑھنے کی دُھن۔

۱۹۴۲ء میں میٹرک کا امتحان دے کر میں دہلی آ گیا اور مجھے ریلوے کے
گیرج کے محکمے میں نوکری مل گئی۔ ۱۹۴۳ء میں بہاول پور میں ہی میری شادی ہو گئی،
ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے میں میری بیوی محترمہ چندر کلا کا... برابر کا
حصہ ہے۔
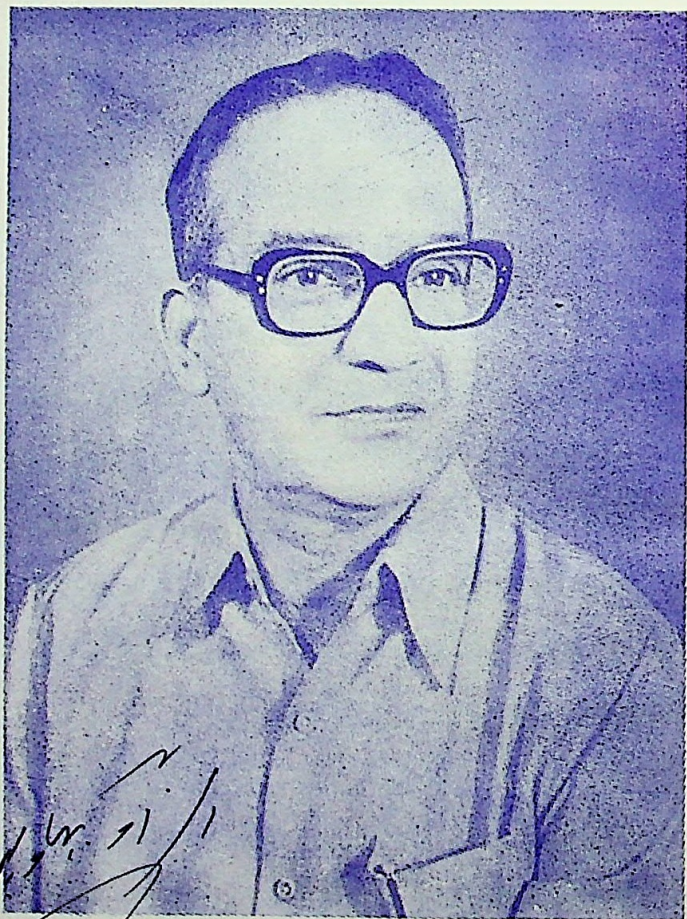
آزاد بہاول پوری

دہلی میں دو سال گزار کر ۱۹۴۲ء میں انبالہ چھاؤنی چلا گیا جہاں گھی ہٹینگ سینٹر میں ملازم ہو گیا۔ یہاں جناب تکلیم جالندھری نے آزاد تخلص دیا، اس سے پہلے پرکاش تخلص کرتا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں دہلی آ کر شملہ چلا گیا جہاں جی۔ ایچ۔ کیو۔ سپر کلینر کمیشن میں جگہ مل گئی۔ مئی ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی، سرکاری دفاتر ٹوٹنے لگے، لہٰذا میں بھٹنڈہ ہوتا ہوا بہاول پور چلا گیا اور ۲؍ جنوری ۱۹۴۶ء کو امپیریل بنک آف انڈیا میں ملازم ہو گیا، یہاں جناب رشید احمد صاحب ایجنٹ تھے، وہاں سے احمد پور شرقیہ (ریاست بہاولپور) پاکستان میں بھیج دیا گیا۔ اس ملازمت میں استقلال ملا، نیز ادبی سرگرمیاں بھی تیز ہوئیں۔ بہاول پور آنا جانا رہتا تھا، جناب عبدالحمید ارشد، جناب آتش بہاول پوری، جناب ظہور نظر اور جناب قدوس انصاری کی صحبت میں اچھا وقت گزرا، کچھ عرصہ بعد قدوس صاحب بھی احمد پور شرقیہ آ گئے، اور ایک اچھا خاصہ ادبی ماحول وہاں بھی بن گیا۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا، ۱۹؍ اگست ۱۹۴۷ء کو آخری مشاعرہ بہاول پور میں زیر صدارت جناب میر شمس الدین صاحب وزیر تعلیم ریاست بہاول پور پڑھا اور نومبر ۱۹۴۷ء میں احمد پور شرقیہ سے براستہ ہندومل کوٹ ہندوستان آ گیا۔ لکھنؤ میں حاضری دی اور تھرمس میں تعینات کر دیا گیا، جہاں سے ۱۹۴۹ء میں دہلی آ گیا۔ اور ۱۹۶۵ء تک رہا۔ یہیں سے

۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل ۱۹۵۸ء میں بی۔ اے کے امتحانات
پاس کئے۔ اس سلسلے میں اپنے دوست پروفیسر وید پرکاش چاولہ کا ممنون
ہوں جن کی تحریک کے بغیر شاید میں یہ امتحانات نہ دے پاتا، اور میری زندگی کا
دھارا موجودہ موڑ نہ کھاتا۔ کالج میں ان دنوں ولیم بلیک کی نظم "دی ہاپینگ
سائکت" پڑھائی جا رہی تھی جس کا میں نے منظوم ترجمہ کر دیا، جو نہ صرف اپنے کالج
میں، بلکہ دوسرے کالجوں کے طلباء میں بھی کافی مقبول ہوئی۔ دہلی کے علاوہ بہت
سے شہروں میں دورانِ ملازمت سکونت اختیار کی، جن میں یہ مقامات قابل ذکر ہیں
پوڑی گڑھوال الموڑہ، جودھ پور، دہرہ دون، رشی کیش، ہردوار، الٰہ آباد، پونہ، غازی آباد، چمولی۔
اب پچھلے پانچ سال سے میرٹھ میں مقیم ہوں، اور یہیں سے اپنا پہلا مجموعہ کلام
پیش کر رہا ہوں، مستقل رہائش غازی آباد میں ہے۔

شعر کہنے کا شوق زمانہ طالب علمی سے ہے، غزلیں اور قدرتی مناظر پر شعر
کہتا تھا۔ دہلی میں جناب احسان دانش کا کلام پڑھ کر کافی متاثر ہوا۔ دیگر
مشاہیر کا کلام بھی پڑھا اور سوچ کو ایک نئی سمت ملی۔ ۱۹۴۵ء میں ترقی پسند
ادب سے روشناس ہوا، اور روایت سے ہٹ کر لکھنے کی ترغیب ملی ۱۹۴۶ء
میں اپنے محترم دوست چودھری ضیاء الحق، جو ان دنوں خان پور میں ضلعدار
تھے، کی ذاتی لائبریری میں ترقی پسند ادب کا کافی بڑا ذخیرہ پڑھنے کو ملا۔ قدیم روایتی
ادب کی جگہ مقصدی ادب کی طرف طبیعت کا رجحان بڑھا۔ ٹریڈ یونین تحریک سے

۱۹۴۲ء سے ہی ریلوے ملازمت کے دنوں سے وابستہ ہو گیا تھا، اس تحریک پر بھی لکھا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۵ء تک بینک ملازمین کی ٹریڈ یونین تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اپنی تقریروں اور نظموں سے اس تحریک کی خدمت کی۔ کامریڈ اتیج۔ ایل۔ پروانہ کے جاں نثاروں میں میرا بھی نام تھا۔ اُن کی بے وقت موت میرے لیے ذاتی صدمے سے کم نہ تھی۔

"متوازی سائے" میں جو کلام شامل ہے وہ مکمل نہیں منتخب ہے۔ عزیزی رشید افروز نے ایک بار کہا تھا "اس میں نہ تو آپ کی آواز مکمل ہے، اور نہ ہی آپ کی پوری شخصیت اُبھر کر سامنے آئی ہے"۔ یہ کافی حد تک بجا ہے، اس تکمیل کے لئے کچھ وقت اور درکار ہے، حالات سازگار رہوں گے تو پھر اپنے کلام کے دوسرے رُخ بھی نمایاں کروں گا۔

قومی یک جہتی، عوامی اتحاد، حمایتِ حقوقِ نسواں، تحفظِ محنتِ غربا اور اسی قبیل کے دیگر موضوعات سے میری پوری شاعری عبارت ہے۔ تنگ نظری اور تعصب کو میں نے انسانی اقدار پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کے استحکام کے نغمے میں نے ہمیشہ گائے ہیں۔ "دو بچیاں، دو سہیلیاں"۔ "آف یہ شاعر" "فرشتے" "انتباہ" "نمائش" "طفلِ بے مکتب" "بسنت" "نیا سال"، "عظمتِ آدم" اس کے ثبوت ہیں۔ "سوویت نغمہ" اور "شہید فیوچک" کے تراجم میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔

مجھے مہارتِ فن کا کوئی دعویٰ نہیں ہے، اپنی موزونیتِ طبع اور ذوقِ سلیم کے سہارے ہی سب کچھ کہا ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کے ساتھ بے تکلفی بھی برتی ہے اور انھیں اسی طرح استعمال کیا ہے جیسے عوام کہتے اور سمجھتے ہیں۔ پھر بھی قارئین کے خیالات جاننے کا منتظر رہوں گا۔

جناب فکر تونسوی، جناب مہدی نظمی، جناب آتش بہاول پوری، جناب ازل دہلوی اور جناب نظام جودھپوری کے گرانقدر مشوروں کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں، جو اس کتاب کے سلسلے میں مجھے اُن سے ملے۔

پیش لفظ کے لیے جناب ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں سے کچھ وقت نکال کر "متوازی سائے" کی عزت افزائی فرمائی۔

اشاعت کی ذمہ داریوں کے لیے جناب سرور تونسوی مدیر "شانِ ہند" کا شکریہ ادا کرنا میرا ایک خوشگوار فرض ہے۔

آزاد بہادر پوری

۹۸۔ آریہ نگر، غازی آباد (یو۔پی)

پیش لفظ

شاعری پیغمبری نہیں ہوتی، جز و ایست از پیغمبری ہو سکتی ہے۔ شاعری کو اسی لیے "فنِ شریف" بھی کہا گیا ہے۔ یعنی ایک ایسا ہنر جو جذباتِ انسانی کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب بھی کرتا ہے رُوح کو بالیدگی، اور وجدان کو تازگی عطا کرتا ہے، وہ شکر کی لذت سے زیادہ لذت گیرا در عیدِ نظارہ سے زیادہ مسرت آگیں ہوتا ہے۔ اسی لئے دوسرے کان لگا کر شاعر کی بات سنتے، سر دھنتے اور مسرور محسوس کرتے ہیں اور یوں اپنی ذہنی تھکن کچھ ساعتوں کے لئے بوسیدہ لبادے کی طرح اُتار پھینکتے ہیں اور زندگی کی رنگ و تازیں پھر نئے سرے سے لگ کر اپنی توانائیوں کو سنجوڑنے لگتے ہیں۔ اس طرح شاعری کا زندگی سے بڑا گہرا

رشتہ ٹھہرتا ہے۔

مگر شاعری وہی کر پاتے ہیں جن کا مشاہدہ تیز ہوتا ہے، جو نت نئے تجربوں سے دوچار ہوتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ رزم سے حاصل ہوتے ہیں یا بزم سے۔ مگر محض تجربے ہی کافی نہیں ہوتے زبان و بیان پر قدرت بھی ناگزیر ہوتی ہے اور اس سے کہیں زیادہ وہ جوش فراواں درکار ہوتا ہے جو کچھ کہنے پر اکساتا ہے۔ اس طرح فکر و خیال، الفاظ و اجمال سب مل کر ایک ایسے جوہر یکتا کی تخلیق کرتے ہیں جسے شاعری کہا جاتا ہے۔ اس کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

یہ شکلیں، یہ تصویریں ہو بہو بھی ہوتی ہیں اور قدرے مختلف اور کبھی کبھی متضاد بھی مگر ان سے جو تاثر پھوٹتا ہے وہ پہاڑی چشمے کے بہاؤ کے مشابہ اور متماثل ہوتا ہے۔ ان تصویروں میں جو رُخ سامنے آتے ہیں وہ جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ ایک سچے اور کھرے شاعر کی یہی پہچان ہے کہ وہ اپنی تصویروں میں انھیں خال و خط کو، انھیں نقوش کو نمایاں کرتا ہے جو دل پر اثر کرتے ہیں یا پھر اس زاویے سے ان پر نظر ڈالتا ہے کہ چشم نظارہ کو حیرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اوم پرکاش آزاد بہاولپوری کی شاعری میں ایسی بہت سی تصویریں ملتی ہیں جو انھوں نے برسہا برس دل کے آئینہ خانے میں سینت کر، سجا کر رکھ چھوڑی تھیں، وقت آیا تو انھوں نے انھیں شاعری کے

چھ کتابچے میں پیش کیا اور یوں اپنا پہلا مجموعۂ کلام، اپنی نظموں، اپنی غزلوں
اپنے قطعات اور اپنے ابیات کے ذریعے پیش کیا، جو یہ ثابت کرنے کے لئے
کافی ہیں کہ آزاد "یک فنے" نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بنیادی طور پر نظم کے
شاعر ہیں۔ اس لئے کہ نظم کو جو ربط و ضبط، جو یک سوئی اور ہم آہنگی ضروری
ہوتی ہے، وہ آزاد کی شخصیت میں موجود ہے۔ قاعدہ، قرینہ، وضع داری
کے اوصاف جس طرح شخصیت کو گلفام بنا دیتے ہیں اسی طرح شاعری کو بھی
ارفع اور ارجمند بنا دیتے ہیں۔ آزاد کے موضوعات بھی زندگی کے امکانات
کی طرح کھلے، وسیع و ہمہ گیر ہیں۔ چنانچہ وہ چاہے نازک ادا مہ پاروں
کا ذکر ہو یا چھوٹی چھوٹی نازک اندام چڑیوں کا، یا بلند پربت کی چوٹیوں
کے عظیم عزائم کی بات ہو کہ خلوت کی بے داد ہو، یا جلوت کی عشوہ طرازی
خوشی کے لمحات ہوں یا رنج و غم کی کیفیتیں، ان سب کو شاعر نے
قریب سے دیکھا ہے، اور دوسروں کو اس طرح دکھایا ہے کہ ہمارے
نازک دلوں کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظمیں "دو بیٹیاں"
"دو بہنیاں"، "کاروان حسینوں سے"، "عظمتِ آدم"، "نمائش"
"تیرے خیال سے دنیا مری حسیں ہے ابھی"، "آخر ہم انجمن سے اُٹھ گئے"
"انتظار"، "جیولس فیوچک" "ترجمہ"، "فرشتے"، "ننھی شہزادی"
"ترجمہ"، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں ایک ٹھوس فکر کے ساتھ ولولہ ہے،

اس کے الفاظ برتنے کا سلیقہ ہے۔ زندگی کا ایک صحت مند رویہ
آزاد کی شاعری اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ وہ زندگی کی ہمہ ہمی
اور اس کے ہنگاموں سے نہ گھبراتے ہیں اور نہ بچوں کی طرح وقتی
آسودگی اور سرخوشی کے کھلونوں سے بہلتے ہیں، وہ واقعات کی تہہ میں اتر
کر اصل حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں، اور اپنی آگہی کا نور دوسروں تک
پہنچانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ چناں چہ "نمائش" سے یہ شعر
ملاحظہ ہوں ؎

وہ آنچل اڑاتے ہوئے مست پیکر
کہ جیسے ہوں طوفان بر دوش اخگر
لہکتے گلستاں وہ ساڑیوں کے
بھٹکتے ہوئے قافلے بجلیوں کے
کوئی طور صورت کوئی پھلجھڑی تھی
نمائش بھی ایمن کی وادی بنی تھی

یہ وقتی تاثر قبول کرنے کے بعد اِن کا ذہن رسایوں کروٹ لیتا
ہے ؎

نمائش کو مانندِ خلدِ بریں تھی
مگر حسن میں کچھ حقیقت نہیں تھی

لئے خود نمائی کے دل میں ارادے

وہ حسنِ نسائی کے زندہ جنازے

یہ ہنگامِ فخر و ستائش نہیں ہے

یہ کیوپڈ کا مکتب نمائش نہیں ہے

جو لوگ رنگینی اور سادگی کو ادوار کے خانوں میں بانٹتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے، اس لئے کہ ہر شخص اور ہر شاعر میں اس کی سادگی یا رنگینی کے علی الرغم ایک رنگین و رومان پرور دل اور ایک سادہ و بے رنگ کیفیت اپنی صد رنگ عشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہوتی ہے، جو اپنے اظہار کے بہانے ڈھونڈتی ہے اور جوں ہی موقع ملتا ہے، بے جھجک و بے جھجک آ دھمکتی ہے اور اس کا بے محابا اظہار ہی دوسروں کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ وہ آزاد جو حسینوں کے قافلہ در قافلہ اور قطار اندر قطار جوانیوں کی سرمستی اور لہک پر کسی ۔۔ پیچ پان منگر کچے کان والوں کی طرح برہم نظر آتے ہیں۔ وہی جمالِ دوست کی ہم نشینی کے لئے گریزاں نہیں بے قرار ہیں ؎

تیرہ اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا

ان سسکتی سی ہواؤں کو دلاسہ دینے

جو مجھے ڈھونڈتی صحرا میں چلی جاتی ہیں
اور اُن بھٹکی ہوئی لہروں سے ملنے کے لیے
جو مجھے دیکھنے ساحل پہ چلی آتی ہیں

تیرہ اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا

اپنی چھینی ہوئی ورشا کی زیارت کے لیے
پوچھنے کے لیے غم گیں طبیعت کا مزاج
نذر کرنے کے لیے چند اُمڈتے ہوئے اشک
ہائے یہ اشکِ محبت میرا سالانہ خراج

یہ چھینی ہوئی ورشا اس مجموعے میں کئی مقامات پر اپنی جھلک دکھاتی
ہے مگر جلوہ عام نہیں کرتی، اور یہ بُری بات نہیں، بلکہ یہ پردہ داری
کھلنے ڈھکنے کا سا انداز تیرِ نیم کش کی تاثیر رکھتا ہے، اس لیے کہ شاعر
کی یادیں اس کا سینہ سے چھپا کرتی ہوئی موجِ تہہ نشیں کی طرح آتی ہیں
اور یہاں آتے آتے وہ موجِ پُرخروش بن گئی ہیں۔ موجوں کی سینہ کوبی آزاد
کے ساتھ دوسروں کو بھی چند لمحوں کے لیے سُن کر جاتی ہے۔ سُننے والوں کے
سامنے ایک سوالیہ نشان آتا ہے، ورشا کو کس نے چھینا؟ کسی اہلِ دولت

نے؟ ورشا کی بے وفائی نے، یا مرگِ ناگہانی نے؟ اسی قبیل کے کئی
سوال ورشا کی بے زبانی، آزاد کی محرومی، شاید یہی محرومی ان کی تمنّا
کے لیے نئے اُفق دریافت کرنے میں مددگار بنی ہو، شاعری سوال اُٹھاتی
ہے، زندگی اُن کے جواب مہیا کرتی ہے۔ اس طرح یہ تعلق اور اٹوٹ ہو جاتا
ہے اور شاعری کی مقبولیت کے لئے راہیں باز کر جاتا ہے۔

آزاد کے اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں، جو نظموں کے ہم پلّہ نہیں،
دراصل غزل کی شاعری فی الواقع وحشتی صنف ہے، یہ میں پوری ذمہ داری
کے ساتھ عرض کر رہا ہوں، درآں حالیکہ بڑی لے دے ہوتی ہے اس
ترکیب پر، اس طریقِ اظہار پر۔ مگر سچّی بات یہ ہے کہ جب دل کا سا
نازک آبگینہ وحشی ہو سکتا ہے (دلِ وحشی) تو غزل کی سی معشوق عربدہ
جو اور بُتِ طنّاز کیوں نہیں وحشی ہو سکتی۔ اس نے جہاں جوہرِ قابل اور
لُولوئے لالہ دیئے ہیں، وہیں بہت سوں کی رسوائی کا سامان بھی بنی ہے
غزل کا شاعر وقت سے جھوٹے رسولوں کی طرح رمتا جوگی ہوتا ہے،
بے نیاز، بے پرواہ، لا اُبالی، ایسا اُبال ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ آج
آبرو کا یہ زیور بے آبروئی کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے، اس لئے کہ جملہ اصنافِ
سخن میں یہ سب سے سستا سہارا ہے جس نے بڑے بھلے دو شعر کہہ لئے
وہی بزعمِ خود شعرائے کرام کی صف میں شہیدوں کی طرح شامل نظر آتا ہے۔ اس

کے بعد جمیع ذمہ داری اور رتی آسانی کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ اپنے آگے ساری خدائی ذرّۂ بے مقدار نظر آتی ہے، اپنے عجز میں بھی غرور کا پہاڑ ہوتا ہے اور یہ شخص اور شاعری دونوں رسوا ہوتے ہیں، اس لئے بڑی بات نہیں کہ آزاد نے اس شیش ناگ سے خود کو بچا کر اپنی شاعرانہ زندگی کے لئے تریاق مہیا کیا ہے۔ پھر بھی جو غزلیں ہیں وہ اپنا مزہ رکھتی ہیں:

پھر انھیں سے یار آنکھوں سے پلا　　میری آنکھوں میں ابھی تک آز ہے

ہجر میں عمریں بیت رہی ہیں　　جیسے دو متوازی سائے
نام کسی کا جب یاد آیا　　جانے کتنے غم یاد آئے

پوچھتے ہیں وہ تعریف بیمارِ غم　　ہم طبیبوں کی پہچان سے بھی گئے

سفر میں اب نظروں سے بھی اوجھل ہوتے جاتے ہیں
اسی رفتار سے بڑھتی گئی منزل تو کیا ہوگا؟

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آزاد نظم، غزل اور قطعات پر یکساں عبور رکھتے ہیں، اس کے ثبوت میں درج ذیل قطعات پیش کئے

جا سکتے ہیں۔ ؎

رات اک زُہرہ جبیں نے جو اُٹھائیں پلکیں
آنکھ سے اشک کے دامن کا سرا چھُوٹ گیا
جیسے جگنو کوئی جنّت سے گرا ہو تھک کر
یا کسی حُور کی چوڑی کا نگیں ٹوٹ گیا

وہ گھڑی جب بھی ذہن میں آئی
صورتِ واردات آئی ہے
ہر مسافر جو کہہ نہیں سکتا
لب پہ میرے وہ بات آئی ہے
جو بھی راہی اِدھر سے گزرا ہے
اُس کو رستے میں رات آئی ہے

(ڈاکٹر) امیر اللہ خان شاہین
صدر شعبۂ اُردو۔ میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ کالج میرٹھ

دو بچیاں، دو سہیلیاں

(اسپتال میں جن کے بستر پاس پاس تھے)

سنتوش کی سہیلی مہرالنسا بنی ہے
اک ڈور دوستی کی، دونوں میں بندھ رہی ہے

بے حد گھٹی فضا میں، ماحول اسپتالی
دو اجنبی دلوں نے راہِ خوشی نکالی

کھدر کے سوٹ پہنے، اور وہ بھی ڈھیلے ڈھالے
کمروں میں گھومتی ہیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے

نکلیں برامدے سے وہ موڑ مڑ رہی ہیں
دو تتلیاں ہیں گویا، گلشن میں اڑ رہی ہیں

معصومیت تو دیکھو دُنیا سے بے خبر ہیں
راہِ خلوص و اُلفت پہ دونوں ہم سفر ہیں

باتوں میں سادگی کے ایسے کنول کھلائیں
سُن لیں اگر فرشتے عزت سے سر جھکائیں

یہ عمر ہے کہ جس میں رُوحوں میں تازگی ہے
ذہنوں میں روشنی ہے، چہروں پہ سادگی ہے

نفرت سے دُور کوسوں، بستی ہے اِن کی دُنیا
ہلکے تبسّموں سے سجتی ہے اِن کی دُنیا

اے کاش، عمرِ انساں میں ایسا دَور آئے
جب ان کی عمر آئے تو عمر ٹھہر جائے

(دہلی)

طفلِ بے مکتب

شب کے پردوں کو ہٹاتی ہوئی گل رنگ شفق
جب مرے ٹوٹے گھروندے کو سجا دیتی ہے
میری پیشانی پہ دو پیار کی مہریں رکھ کر
ماں مری نیند کی پریوں کو اُڑا دیتی ہے

نیند اور وہ بھی لڑکپن کی مگر کیا کیجے
ٹوٹ جاتی ہے کھلونوں کی قطاروں کی طرح
خواب کے طاق سے گر جاتے ہیں لذت کے چراغ
ٹمٹماتے ہوئے مشرق کے ستاروں کی طرح

چند مانوس دُعاؤں کا سہارا لے کر
سینکڑوں سال سے ہر ماں جنھیں دُہراتی ہے
گھر سے آتا ہوں میں اُن دودھ کے بچوں کی طرح
راہ میں جن سے مری راہ بدل جاتی ہے

وہ چلے جاتے ہیں تعلیم کے ایوانوں میں
علم و تہذیب کے سانچوں میں سنورنے کے لئے
بیچتا ہوں میں مشقت کی متاعِ معصوم
بھوک اور موت کے ڈر سے گزرنے کے لئے

میری کم عمری میں محنت کا یہ بڑھتا ہوا بوجھ
مجھ کو تعلیم کی سرحد سے پرے رکھتا ہے
بھوک کا درد ہر اک درد پہ حاوی ہو کر
مرے احساس کے زخموں کا مزہ چکھتا ہے

کتنی حسرت سے میں تکتا ہوں سرِ راہ گزر
سوئے مکتب مرے ہم عمر کئی جاتے ہیں
جن کے رنگین لباسوں کے حسیں اندر نقش
ٹوٹتے بنتے بہت دور نکل جاتے ہیں

(دہلی، میرٹھ)

اُف یہ شاعر

دوستو! کچھ شاعروں سے کر رہا ہوں میں خطاب
میں ہٹانا چاہتا ہوں جن کے چہروں سے نقاب

بیہودہ شاعر ہیں جنہیں عنواں کوئی ملتا نہیں
دیکھ کر دُنیا کی عزت ان کا دل ہلتا نہیں

یہ جہالت کے نمائندے قدامت کے نقیب
علم و دانش سے پرے، اور رہبانیت کے قریب

داس ہے ان شاعروں کو یہ گرانی کا نظام
اپنے گرد و پیش یہ رشوت ستانی کا نظام

کان ان کے بے خبر ہیں فاقہ کش کی آہ سے
پاؤں ہیں ناآشنا ظلم و ستم کی راہ سے

ان کی نظریں قحط و بیماری پہ منڈلاتی نہیں
ان کو اسبابِ مصائب کی سمجھ آتی نہیں

ایک عنواں ہے یہ جس سے برسرِ پیکار ہیں
دُختران ہند کی تعلیم سے بے زار ہیں

ان کی نظروں میں وہ لڑکی خالی از کردار ہے
سوئے کالج جو سڑک پر مائلِ رفتار ہے

ان کے مشرب میں ہر اک لکھی پڑھی بدنام ہے
ہر سڑک پر جانے والی کا طوائف نام ہے

ہر حسیں چہرے سے نفرت ہے انھیں کچھ اس قدر
بَیل جیسے چونکتا ہے لال کپڑا دیکھ کر

جو مصفا ہیں ان کی عقلِ نارسا سے دور ہیں
یہ اُنھیں پر فتویٰ دینے کے لیے مجبور ہیں

ہے عناد و بغض ان کو ہر نئی تخلیق سے
سوچ ان کی دُور رہتی ہے حدِ تحقیق سے

اس قدر بوسیدہ ان کی عقل کا ماحول ہے
ہر نئی تحریک ان کے واسطے لاحوّل ہے

اُف یہ شاعر ہیں، روایاتِ کہن جن کا مدار
راکٹوں کی دوڑ میں ہیں بیل گاڑی پر سوار

کاش یہ اُٹھیں حدودِ مُلک سے ہو کر بلند
اک نظر دوڑائیں یہ از قاہرہ تا تاشقند

عزمِ نسواں دیکھتے ہی ان کے دل ڈھ جائیں گے
لڑکیوں کے سب تصوّر ٹوٹ کر رہ جائیں گے

چھاپہ ماروں اور ہوا بازوں میں یہ مل جائیں گی
اتریں صف کے خلا بازوں میں یہ مل جائیں گی

علم و فن میں سب سے بازی لے رہی ہیں لڑکیاں
فرض سے حصّہ زیادہ دے رہی ہیں لڑکیاں

غوغائے رجعت پرستی روک پائے گا انھیں
کوئی دقیانوس ناقد ٹوک پائے گا انھیں

سائرہ، بلقیس، انجو، مسکراتی جائیں گی
شانتا، شیلا، شکیلہ، کھلکھلاتی جائیں گی

ر. جودھ پور،

سرے سنپال سے

دُنیا بُری نہیں ہے ابھی

(احمد بشیر قیصر (پاکستان) سے ایک والی بال ٹیم کی دہلی میں آمد پر دوست آتین کے نام ایک نامہ۔)

آتین تجھ سے ملے آج کچھ سفیرِ وطن
بصد خلوص و محبت ہمارے ہاتھ ملے
نقوشِ عہدِ گزشتہ کے ذہن میں اُبھرے
کہ جیسے صحرا میں راہی کو اک برات ملے

وہ اُن کے ہاتھوں کی گرمی مہک وہ سانسوں کی
وہ اُن کے چہروں کے مانوس خدوخال نہ پوچھ

وہ ہم زبانی میں تحلیلِ عجز و شیرینی
قتیلِ ہجرِ وطن میرے دل کا حال نہ پوچھ

مگر سنا ہے کہ وہ تجھ سے بے ملے آئے
دلِ حزیں پہ ہوئی ایک جراحتِ تازہ
اگر وہ ہاتھ بھی رکھتے تو ہو نہ سکتا تھا
مرے دھڑکتے ہوئے دل کا اُن کو اندازہ

رہِ خیال سے ہو کر بہت جلوس گئے
نگاہِ منتظرِ آمدِ امیں ہے ابھی
فلک پہ ابر کے ٹکڑوں میں ماہِ نو کی طرح
ترے خیال سے دُنیا مری حسیں ہے ابھی

(دہلی)

بسنت

لب پہ ہر فرد و بشر کے آج ہے نامِ بسنت
مہرِ عالم تاب پھر لایا ہے پیغامِ بسنت

آج پھر اک بار ٹوٹے ہیں طلسماتِ خزاں
گوشے گوشے میں چمن زاروں کے ہیں ہریالیاں

بیل، بوٹے، جھاڑیاں، پتے، شگوفے اور گھاس
پیشوائی میں خوشی کی سب نے بدلے ہیں لباس

از زمیں تا آسماں جو چیز ہے سرشار ہے
جس کو بھی دیکھو خمِ فطرت کا بادہ خوار ہے

نوجوانوں کی صفیں ہیں خوش بسنتی رنگ میں
سورما ہنستے ہوئے جاتے ہیں جیسے جنگ میں

مست خوشی میں ہیں خراماں حُسن کی شہزادیاں
بخت کے چہروں پر ہیں خونِ تازہ کی شادابیاں

ان کو اے بادِ صبا جا کر مرا پرنام دے
شاعرِ فطرت کے احساسات کا پیغام دے

آج کا دن کیوں منایا ہے بشانِ امتیاز
ہے کوئی جو مجھ کو سمجھائے گا یہ پیچیدہ راز

میں نہیں سمجھا ابھی تک باعثِ جشنِ بسنت
ہو گیا ہے آج کیا بھارت کی ناداری کا انت

آج موسم نے خبر دی ابرِ رحمت بار کی
ہند پہ تو روز چھائی ہے گھٹا ادبار کی

تم ہو خوش آئیں گے اب بادِ خنک کے کارواں
چل رہی ہیں یہاں ہند میں آہوں کی ٹھنڈی آندھیاں

آج سرسوں نے کیا ہے زرد پھولوں سے سنگار
ہند میں بے خون چہرے ہیں قطار اندر قطار

یہ تو جھوٹا ہے بسنت اور میری اُمید سے دُور
جس کا میں ہوں منتظر وہ آئے گا اک دن ضرور

جس گھڑی بے رنگ چہروں پر بھی دیکھا سکوں
بے خطر ہو لوٹے گا مزدوروں کی شریانوں میں خوں

جب ملوں کے در کھلیں گے طبقۂ نادار پر
جب کسانوں کا زور ہوگا صرف پیداوار پر

جب کہ دریاؤں کا پانی کھیتیاں لہرائے گا
ایک قطرہ بھی سمندر میں نہ جانے پائے گا

جب بنائیں گی یہاں کپڑا ملیں دن اور رات
مُلک کی ساری ضرورت سے زیادہ پارچات

جب کہ دہقاں زادیاں بھی ڈھانپیں گی اپنے تن
پھینک دیں گی دُور کھیتوں سے دریدہ پیرہن

جب غریبی اک پُرانی داستاں کہلائے گی
آدمی سے آدمی کی لُوٹ بند ہو جائے گی

آئے گا اُس زیست کا اعلان فرماتا بسنت
رقص کرتا، کھلکھلاتا، جھومتا، گاتا، بسنت
جب وہ دن آئے گا میں پھر مسکراتا آؤں گا
اپنے احبابِ وطن سے تالیاں بجواؤں گا

دہلی

شریکِ حیات سے

(اپنے ایک بچّے کی موت پر)

وہ جس کی موت پر یہ ہر طرف سے تعزیت نامے
اَلم کے دیو ہیں اوڑھے ہوئے الفاظ کے جامے

بپا دِن رات ہنگامے فغاؤں کے معاذ اللہ
چمن زاروں پہ یہ پہرے خزاؤں کے معاذ اللہ

یہ رونا، آہ، نالے، شور و غل بے سُود ہے ہمدم
کہ عقلِ آدمی کا دائرہ محدود ہے ہمدم

یہ مانا تجھ کو اپنے لاڈلے کی موت کا غم ہے
حقیقت میں یہ رونا اپنی کم علمی کا ماتم ہے

تجھے معلوم ہو یہ آج کل کے بے وفا بیٹے
ہوا سے رنج سے عاری یہ عشرت آشنا بیٹے

محلاتِ عدم سے جب بھی یہ اُکتا کے آتے ہیں
غریبوں کے شکستہ جھونپڑے اپنے بناتے ہیں

یہ اُن کے واسطے بنتے ہیں اک حیلہ مسرت کا
بھلا دیتے ہیں اُن کے دل سے غم بارِ مشقت کا

مگر جب ان کا دل بھر جاتا ہے سیرِ سیاحت سے
تعارف ان کا جب ہوتا ہے اُن کی رنج و عسرت سے

تو پھر ان کو محلاتِ عدم کی یاد آتی ہے
وطن کو لوٹ جانے کی تمنا گُدگُداتی ہے

یہ اسیٹھ پاؤں ہی واپس چلے جاتے ہیں پیچھے سے
یہ ہنسنے کھیلنے والے ستم ڈھاتے ہیں پیچھے سے

حقیقت میں یہ غربت کے مصائب سہہ نہیں سکتیں
گھروندوں میں شہنشاہوں کی روحیں رہ نہیں سکتیں

(پاتھر س)

نعم البدل

قوم کے ہاتھوں سے روٹی کا نوالہ چھین کر
ایک مندر کا کھلونہ دے دیا زردار نے

اب عقیدت مند ہیں اور دیوتاؤں کا فریب
یوں بچایا اپنا پیسہ منعم عیار نے

کام آیا دھرم تو بس اہل سرمایہ کے کام
دے رہا ہے فاقہ مستوں کو غذائے رام رام

(دھلی)

نیا سال

اُن کی دعوت پہ آگرہ کا سفر
دل میں لاکھوں خیال آتے ہیں

کالی راہوں پہ چھوٹے چھوٹے گڑھے
بس کے پہیوں میں آئے جاتے ہیں

شاخیں اُلجھی ہیں ہر نگوں ہیں شجر
جھونکے ہر چند گدگداتے ہیں

چپٹے پتھر نشان میلوں کے
بس کے بائیں گزرتے جاتے ہیں

جیسے مفلس کی زندگانی میں
ایک جیسے ہی سال آتے ہیں

(آگرہ)

فرشتے

(دہلی کے ایک اسپتال میں لکھی گئی)

بہن لکشمی کی علالت کے باعث
مرض کی انوکھی نزاکت کے باعث

اُنھیں اس شفا گھر میں داخل کرانے
دوا کی کرامات کو آزمانے

کھُلے وارڈوں میں کچھ آتو گیا ہوں
مگر اجنبیت سے جھجکا رہا ہوں

...... زمانہ ہے اس جا کا نقشہ جُدا ہے
الگ سارے عالم سے ان کا خُدا ہے

بہت دُور تک بستروں کی قطاریں
مریضوں کی چلّاہٹیں اور پکاریں

دواؤں کی بھبکوں سے پھیلا تعفّن
قضا کا مریضوں کی جاں سے تفنّن

غرض عقلِ آزاد دنگ ہو رہی ہے
مرض اور مریضوں میں جنگ ٹھن رہی ہے

مگر ایک جانب لئے زندگی سی
اُمیدوں کی اُوشا نے نکھری ہوئی سی

کہیں خادمائیں تنی جا رہی ہیں
کہیں نرسیں اُڑتی چلی جا رہی ہیں

مرے سانس گہرے ہوئے جا رہے ہیں
ڈھلی وردیوں میں سفیر آ رہے ہیں

کیے گوُن کو باد باں جا رہی ہیں
لیے کشتیاں جا رہی ہیں

ذرا ہنس کے کڑوی کسیلی دوا دیں
تو زہرِ ہلاہل کو امرت بنا دیں

انھیں یوں ہی آتا ہوا دیکھ لیں جو
تو آدھا مرض دیکھتے ہی ہوا ہو

یہ جگنو چمکتے چلے جا رہے ہیں
برانڈے دمکتے چلے جا رہے ہیں

گئی کون چھپکے سے ہنستی ہوئی یہ
ہمالہ کی برفوں سے ترشی ہوئی یہ

جُدا یوں سے روماں تک ٹوٹی ہے یہ
حقیقت میں اک شعلہ طُور ہے یہ

ترنُّم سے آواز بھر پور ایسے
کہ ہر لفظ اک گیت کی شکل جیسے

یہ جی میں ہے ایسے ہی گاتی رہے یہ
کہ گھنٹوں ہی باتیں سُناتی رہے یہ
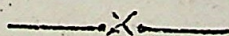
تنومند پہ یہ اثر اس فضا کا
تو ماندے مریضوں کا کیا حال ہوگا

سنو اے فرشتوں کا دم بھرنے والو
خیالی حکایات پڑھنے والو

الو ابنِ آدم کی اُمت یہی ہے
کہ فلورینس کی شانِ خدمت یہی ہے

فرشتوں سے نرسوں کا درجہ سوا ہے
پرندوں کے سوا اور فرشتوں میں کیا ہے

(دھلی)

میرٹھ

یہ شاہدین کے ویروں کی زمیں عزت کے قابل ہے
یہ آزادی کی دولت کی امیں عزت کے قابل ہے
جو ذرہ ذرہ کرا اُبھرتی ہے سدا خونیں موترخ ہیں
یہ میرٹھ ایک ارضِ دل نشیں عزت کے قابل ہے

(میرٹھ)

میرا

کعبۂ عشقِ کنہیا، یادگارِ دائمی
مہرِ صفا چل کر اسی مندر میں سجدہ چاہئے

اُس کے روحانی مراحل سے گذرنے کے لئے
ایک نغمہ، ایک مستی ایک دنیا چاہئے

ارضِ راجستھان میں آزاد کہنے کو غزل
قلبِ میرا، عشقِ میرا، سوزِ میرا چاہئے

(ریتودہ پور) :

اَلموڑہ والوں سے

مرے دردِ دل کی دوا بھیج دو
پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا بھیج دو ۔

نمائش

علی گڑھ یہ علم و ادب کا خزانہ
مرے پیارے احباب کا آستانہ

یہ شعر و سخن کے ستاروں کی دنیا
ادیبوں، فسانہ نگاروں کی دنیا

یہاں کی فضاؤں میں ہے دل رُبائی
یہاں خاک میں ہیں اثر کیمیائی

یہاں ہر گلی ہے برنگِ ستائش
ہر اک سال اُٹھتا ہے شورِ نمائش

یہی ذکر ہوتا ہے پیر و جواں میں
نمائش کا امسال بھی جشن دیکھیں

فقط تھی یہ عبدالاحد کی عنایت
کہ میں نے کی جا کر نمایش میں شرکت

وہ باپ مزمّل سے آگے گزر کر
کہ فردوس کے اوّلیں مرحلے پر

ضیا پوش تھیں اس طرح کچھ فضائیں
کہ انجم بھی شرما کے نظریں جھکائیں

ملاحت کی ہر سمت پیغمبری تھی
نگاہوں کی خلقت پہ جادوگری تھی

تراشے ہوئے صبحِ گلشن سے پتلے
وہ فطری تخیّل کے رنگین نقشے

وہ آنچل اُڑاتے ہوئے مست پیکر
کہ جیسے ہوں طوفان بردوش ساگر

لپکتے گلستاں وہ ساڑیوں کے
بھٹکتے ہوئے قافلے تتلیوں کے

سیہ فام بدروں میں خوش رنگ چہرے
وہ اُٹھتے، اُبھرتے، نکلتے سویرے

وہ مستانہ رفتار نظم مسلسل
وہ نبضوں کی دھڑکن سے ہمگام ہر دل

کوئی حور صورت کوئی پھلجھڑی تھی
نمائش بھی ایمن کی وادی بنی تھی

نمائش گو مانندِ خلدِ بریں تھی
مگر حسن میں کچھ حقیقت نہیں تھی

لیے خود نمائی کے دل میں ارادے
وہ حسنِ نسائی کے زندہ جنازے

روش کیف آور، نظر شرمساماں
تصنّع میں ڈوبے سراپِ خراماں

اِدھر عشق پیشہ جوانوں کے ٹولے
اُدھر آنچلوں کے وہ پیہم جھکولے

یونہی دیکھ کر مسکرانے کی کوشش
وہ نظروں میں خود ہی سمانے کی کوشش

کہیں عشق تھا حُسن کے دائروں میں
کہیں دام اُلجھا ہوا طائروں میں

وہ شانوں سے شانے لڑانے کے منظر
وہ اِٹھلا کے دامن بچانے کے منظر

یہ بے شرم تھے یا عشا ر بخ دونوں
تمدّن کے تھے مرثیہ سنج دونوں

ذرا رزائیِ حُسن گھبرا گیا میں
یہ کہتا ہوا لوٹ کر آ گیا میں

یہ ہنگامِ فخر و ستائش نہیں ہے
یہ کیوپڈ کا مکتب نمائش نہیں ہے

(علی گڑھ)

بہاریں پھر بھی آئیں گی

(ہدایت کار گورو دت کے انتقال پر)

مجھے فلموں سے دلچسپی ہے لیکن صرف اتنی ہے
کوئی اچھی سی تصویر آئے تو میں دیکھ لیتا ہوں
مگر اے دوست تیرے جانے سے کیا جانے کیا گذری
کہ میں لرزاں قلم سے آخری تحسین دیتا ہوں

جن اچھی اچھی تصویروں کا میں نے ذکر چھیڑا ہے
کچھ اُن میں ایسی تصویریں ہیں جن پر نقش ہے تیرا
کہیں تیری اداکاری، کہیں تیری ہدایت ہے
رہا میدانِ فلم و فن پہ حاوی رَخش ہے تیرا

لے مرحوم کی فلم کا نام

شراب شعر و فن کے جام جو دیتا تھا دنیا کو
ہوا رخصت وہ ہم تشنہ لبوں کو چھوڑ کر پیاسا[1]
ہیں کہنا چاہتا ہوں آج یہ اندازِ غالب میں
مری جاں چودھویں کا چاند یکدم تو نہیں چھپتا[2]

نئی فلموں میں جب مظلوم گیتا[3] گیت گائے گی
ترنم کی تہوں میں ایک دردیلی صدا ہوگی
کہ جیسے ایک ویرانے میں سوکھی شاخ پر کوئل
کرے گی جب فغاں تو ایک جلن دل کی سوا ہوگی

یہ مانا صبر کر لیں گے یہ تیرے چاہنے والے
یہ مانا ایک گل سے گلستاں خالی نہیں ہوگا
مگر یہ بات کیوں دل کو مرے پیہم رلاتی ہے
بہاریں پھر بھی آئیں گی مگر مالی نہیں ہوگا

(دہلی)

---

[1] و [2] مرحوم کی فلموں کے نام [3] مرحوم کی مشہور مغنیہ بیوی، اب مرحومہ

عظمتِ آدم

(تقسیمِ ہند پر ہوئے فسادات پر)

وہ جن کے خوں سے بنا ہو پیمبروں کا لہو

وہ جن کے ہاتھوں رشی لوگ پرورش پائیں

وہ جن کی گود میں بیتتا ہے روزگار بیلے

وہ جن کے آگے فرشتوں کے سر بھی جھک جائیں

وہ جن کی عصمت و عفت کے پاک نغموں کو

ازل کے روز سے تاریخ گنگناتی ہے

وہ انگنائیں جو جلتی چتاؤں میں اتریں

وہ جن کی یاد زمانے کو سنسناتی ہے

وہ پاک بیبیاں جن کے غیور قدموں کو
رہِ کتاب سے کوئی بھی ڈگمگا نہ سکا
وہ جن کو صرف ستارے ہی دیکھ سکتے تھے
وہ جن کو کوئی بشر بے نقاب پا نہ سکا

اب اُن کی بہنوں پہ اس بیسویں صدی میں ندیم!
عذاب آئے ہیں آفت کے سیل آئے ہیں
اُنھیں پہ ٹوٹے ہیں رشیوں کے مستبد بیٹے
اُنھیں پہ ابنِ پیمبر نے ظلم ڈھائے ہیں

وہ جا رہا ہے گرجتا درندگی کا جلوس
مظاہرین نے سینوں کے ہار پہنے ہیں
سرِ جلوس ہیں ننگی ہوئی حسینائیں
وہ جن کو عظمتِ آدم کے ظلم سہنے ہیں

(بٹھنڈہ)

ہمارے عزم کا سورج وہیں سے ابھرے گا

(ایک پڑوسی ملک کی جیل میں ایک جمہوریت پسند نوجوان
کے قتل کی خبر پڑھ کر)

صفِ شہیداں میں اک فرد کا اضافہ ہوا
سجا اک اور ستارے سے حرّیت کا اُفق
اک اور نام بڑھا فہرستِ سرفروشاں میں
لہو میں ڈوبا ہے تاریخِ آدمی کا ورق

تری دلیری پہ نازاں ہیں اہلِ آزادی
بکھر گیا ترا چرچا وطن کے یاروں میں
در اصل بن کے تو بارش کا اوّلیں قطرہ
برس گیا ہے حکومت کے ریگزاروں میں

تو تحریک کی موذن وہم ازل سے رہا
نئی نہیں یہ پرانی ہی بانگ ہے ہم دم
یہ اور بات ہے کہ حکمراں تراش ہی ہیں
وہ ہاتھ جس میں ہے آزادیٔ وطن کا علم

مؤرخوں نے ہر اک دور میں یہ لکھا ہے
شہید برتر و بالا ہیں حکمرانوں سے
یہاں زبان و بیان منطق و دلائل ہیں
وہاں محافظت تخت ہے سنانوں سے

گر آج سطوت پرویز کا تسلط ہے
تو صبح فردا یہ خبریں لگی ہیں فرہادی
ترے رفیقوں کے تیشوں کی آہنی ضربیں
قریب لائیں گی ان آمروں کی بربادی

ترے نقوشِ قدم جس مقام تک پہنچے
ہمارے عزم کا شعور نج وہیں سے اُبھرے گا
حیات ساتھ ترا جس جگہ پہ دے نہ سکی
وہیں سے قافلہ اہلِ وفا کا گزرے گا

(دہلی)

انتباہ

رجعت پرستوں کو

یہ عہدِ نو کے غبی، وعدہ فراموش و دُشمنت
ساعقہ بن کے حقیقت پہ گرجنے والے
اِن کو معلوم نہیں عشقِ مشکل کیا شے ہے
یہ عقیدت کو تجارت ہی سمجھنے والے

کاش سُن لیں یہ جماعت سے گُریزاں چُٹکے
آندھیاں روک لو، اتنی تو سکت تم میں نہیں
غم و غصّہ کے اُبلتے ہوئے لاوے کا اگر
چاہو رُخ پھیر دو، اتنی تو سکت تم میں نہیں

اپنی ناکام سیاست کو چھپانے کے لئے
مندر و مسجد دیر ذال کا سہارا مت لو
بے اثر نعروں سے جنتا کی آمشتی تحریک
توڑنے کے لئے شیطاں کا سہارا مت لو

اپنے مفلوج کرم خوردہ دماغوں کو لئے
منقلبِ وقت کی یلغار سے مت ٹکراؤ
سرِ بر افلاک ارادوں کو کچلنے کے لئے
جھوٹے افسانوں کے انجام سے مت سہماؤ

سرخ کرنوں سے ہے بھرپور افق کا دامن
گھٹتی جاتی ہے شقاوت کی شبِ تیرہ و تار
یہی رفتار رہی گر تو وفاؤں کے قدم
روند ڈالیں گے مٹا دیں گے جفاؤں کے مزار

(دہلی)

غزلیات

ہجر میں عمریں بیت رہی ہیں
جیسے دو متوازی سائے

نیچی نیچی پلکیں ہائے
چاہا لیکن بھول نہ پائے

نام کسی کا جب یاد آیا
جانے کتنے غم یاد آئے

داغِ جگر تو چھپ سکتے ہیں
لیکن دامن کون چھپائے

ہجر میں عمریں بیت رہی ہیں
جیسے دو متوازی سائے

پاس رہے تو عشق ہے جنّت
دُور رہے تو آگ لگائے

اُٹھو اے بے نُور نگاہو
حُسن نے پھر جلوے بکھرائے

شامِ حیات آ پہنچی ہے
گہرے ہو گئے موت کے سائے

رُسوائیٔ آزادؔ گوارہ
حُسن پہ کچھ الزام نہ آئے

(دہلی)

۱

آج مقتل میں گُل کھِل گئے
سر جھکائے سے قاتل گئے

ہم تلاشِ بہاراں میں تھے
راہ میں آپ ہی مل گئے

زندگی گنگنانے لگی
آپ کے لب جہاں ہِل گئے

زخمِ دل اُن کی مسکان پر
کچھ کھِلے اور کچھ سِل گئے

اُن کے چلنے کی آواز تھی
یا فرشتوں کے پَر ہِل گئے

آپ نے مڑ کے دیکھا ہمیں
درد کو حوصلے مل گئے

خوش نصیبی سے آزاد کو
آپ سے اہلِ دل مل گئے

(المورّہ)

پھر یہ خفگی یہ خمار کیا معنی؟
یہ ستم بار بار کیا معنی؟

انسیت دوستی کا حاصل ہے
دوستی میں وقار کیا معنی؟

بال بکھرے ہیں چہرہ اُترا ہے
یہ خزاں کی بہار کیا معنی؟

میری پرسش مرے رقیبوں سے
اے تغافل شعار کیا معنی؟

جام مینا سے ہو گئے محروم
قسمتِ بادہ خوار کیا معنی؟

ایک عرصہ ہوا ہے طوفاں کو
اب فضا میں غبار کیا معنی؟

شعریت اور کلام میں آزاد
جب کہ بوہم ہو بار کیا معنی؟

(دہلی)

الغرض اُن کی زباں پر میرا نام آ ہی گیا
دلِ تمنائی تھا جس کا وہ مقام آ ہی گیا

ڈوب کر نبضیں اُبھر آتی ہیں پھر اُمید کی
کام آخر تیرا وہ وعدۂ خام آ ہی گیا

بادہ خواروں نے کیا جب میکشی سے اجتناب
محفلِ رنداں میں ساقی مے بجام آ ہی گیا

دیکھتے ہی رہ گئے سارے بلانوشِ ازل
اُن کے ہاتھوں سے مرے ہاتھوں میں جام آ ہی گیا

وہ اُٹھے محفل سے سمجھا حضرتِ آزاد نے
آفتابِ زندگی کا وقتِ شام آ ہی گیا

([illegible])

قاتلوں نے مری تصویر لگا رکھی ہے
کتبۂ قبر پہ شمشیر لگا رکھی ہے

عہدِ حاضر کا جنوں توڑ رہا ہے اُس کو
عقلِ کہنہ نے جو زنجیر لگا رکھی ہے

اب یہ عالم ہے کہ سامع نہیں ملتا اُس کو
جس نے ہر بات پہ تعزیر لگا رکھی ہے

گھر بھی ظالم نے روایت سے سجا رکھا ہے
کہیں خنجر، کہیں شمشیر لگا رکھی ہے

اُن کی آمد میں جلا رکھے ہیں آنکھوں کے چراغ
جن کی اک عمر سے تصویر لگا رکھی ہے

(میٹھو)

جو ترے غم سے معمور ہوتے گئے
حرفِ تقدیر منصور ہوتے گئے

تیری زلفوں کی آوارگی دیکھ کر
ہم سنبھلنے پہ مجبور ہوتے گئے

ہم سے بچ کر نکلنے لگے جس قدر
آپ اُتنے ہی مشہور ہوتے گئے

منزلوں کے چراغوں کی حسرت لئے
راہی راہوں میں بے نور ہوتے گئے

زندہ دل ہیں وہ محروم جام و سبو
ذکر سے جو مخمور ہوتے گئے

فصلِ گُل بار ہا جا کے آ بھی گئی
ایک ہم ہیں کہ مہجور ہوتے گئے

جن تقاضوں سے برہم تھا پیرِ مُغاں
مے کدوں سے وہ دستور ہوتے گئے

(دہلی)

ابتدائے عشق ہے، آغاز ہے
حُسن مصروفِ خرامِ ناز ہے

کس کے پرتوِ سے منوّر ہے حیات؟
کس کی چشمِ ناز کا اعجاز ہے؟

چھوٹتی نبضوں میں اب جنبش کہاں
نغمۂ غم بے نیازِ ساز ہے

دل کی دھڑکن ہو رہی ہے تیز تر
کون سا لے نغمہ زن یہ ساز ہے؟

آپ بھی کرنے لگے اخفائے عشق
آنکھ کی سُرخی مگر غمّاز ہے

پھر انھیں مے بار آنکھوں سے پلا
میری آنکھوں میں ابھی تک آز ہے

مشتق ہیں آزاد پھر دیپک کا راگ
"میری ہستی وقفِ سوز و ساز ہے"

(اقبال چپاوَنی)

سرابِ حُسن میں ذوقِ نظر کی لغزشیں توبہ
کہ ہر نقشِ قدم کو اہلِ دل منزل سمجھتے ہیں

گلستانِ تمنا میں جو گُل کھلتے ہی مرجھائے
سمجھنے والے اُس گُل کو بہارِ دل سمجھتے ہیں

حسینوں کی غلط فہمی کا یہ عالم معاذاللہ
جو اپنی زندگی دے دے اُسے سائل سمجھتے ہیں

مرے شکووں سے وہ شاکی مرے نالوں سے ہیں نالاں
خدا جانے وہ کس محفل کو اب محفل سمجھتے ہیں

خدا حافظ ہے اُن لوگوں کا جو آزاد ہیں دنیا میں
"بھنور کو اپنی کشتی موج کو ساحل سمجھتے ہیں"

(بہاولپوری)

دلِ ناداں تجھے رونے سے کچھ حاصل تو کیا ہوگا
بجائے لطف مجھ سے چڑ گیا قاتل تو کیا ہوگا؟

سفینہ میرا گردابِ بلا میں دیکھنے والو!
"اگر ہر موج خود ہی بن گئی ساحل تو کیا ہوگا؟
تلاشِ راہِ منزل میں زمانے بھر کو ٹھکرا کر
اگر دھوکے سے میں ٹھکرا گیا منزل تو کیا ہوگا؟
فلک پر ابر پاروں میں مہِ نو دیکھنے والے!
اگر یاد آ گیا کوئی مہِ کامل تو کیا ہوگا؟
سفر میں اب وہ نظروں سے بھی اوجھل ہوتے جاتے ہیں
اسی رفتار سے بڑھتی گئی منزل تو کیا ہوگا؟

بیاباں کے جنوں انگیز جھونکو راستہ بدلو!
تمیزِ جیب و داماں ہو گئی مشکل تو کیا ہوگا؟

دہا تھرسی؛

جو وفاؤں کے پیمان سے بھی گئے
وہ دُعاؤں کے دامان سے بھی گئے

آپ تو رسمِ اُلفت ہی سوچا کئے
جانے والے تو جی جان سے بھی گئے

کیا خبر کن کناروں سے ٹکرائیں گے
وہ سفینے جو طوفان سے بھی گئے

پُوچھتے ہیں وہ تعریفِ بیمارِ غم
ہم طبیبوں کی پہچان سے بھی گئے

کل تو مے کی کمی کا تھا شکوہ ہمیں
آج ساقی کی مُسکان سے بھی گئے

(دہلی)

تراجم

کھل رہی ہے صبحِ صادق سرخ پھولوں کی طرح
بھیجتی ہے مرنے والے کو عقیدت کا سلام

شہید فیوچک[۱]

(جناب سریندر ناتھ چٹو پادھیائے کی انگریزی
نظم "فیوچک" کا آزاد ترجمہ۔)

ہو چکا ہے وہ سراسر واقف رازِ حیات
حلقۂ زنجیر اُس کو قید کر سکتا نہیں
وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے ساتھ ہیں لاکھوں عوام
اور وہ تنہا نہیں، تنہا نہیں تنہا نہیں

سرد پڑتی ہی نہیں اُس کی نگاہوں کی تپش
وقت چاہے لاکھ ہو نازک مہیب و پُرخطر
(حق پرستوں کے مقدس خون کے قطرات کی)
تا ابد ممنون ہو گی کامرانیِ بشر

۱۔ جیکوسلاویکیہ کا عظیم رہنما جو فاشسی جرمن قبضہ کے دوران قیدخانہ ہی میں قتل کر دیا گیا۔

دم بخود تاریخِ عالم ہے یہ منظر دیکھ کر
بڑھ رہا ہے وہ خوشی میں ڈوب کر سوئے اجل
جیسے اک دلہن کے ہاتھوں سہرا لینے کے لئے
جا رہا ہو سرخوشی میں جھومتا دولہا مچل

یہ بندہ جوشِ شہادت سے سراپا سخت ہے
تن رہی ہے سنسناہٹ سے بدن کی قاش قاش
اک بلند آواز نقّارہ ہے سینے میں کہ دِل !
بج رہا ہے جس سے پیدا اک جہاں میں ارتعاش

نشر کرتا ہے یہ اک اعلانِ وعدۂ امید
نو نویلی طاقتوں کے دوش پر ہو کر سوار
آ رہا ہے رفتہ رفتہ اک نظامِ نو قریب
بن رہی پھانسیوں کی رسّیاں پھولوں کے ہار

پھول کی صورت کھلے ہوں جس کے سینے میں عوام
وہ بہادر سرفروش انسان مرتا ہے کہیں
بزدل و غدار و ظالم حکمرانوں کے لئے
موت اس جاں بازی کی ہے اک جوابِ بہتریں

کھل رہی ہے صبحِ صادق سرخ پھولوں کی طرح
بھیجتی ہے مرنے والے کو عقیدت کا سلام
اس کی لاثانی شہادت کا کرشمہ ہے کہ آج
جسم لے کر آ رہی ہے اک نئی روحِ عوام

(دھلی)

نغمۂ شہنائی

(ولیم بلیک کی نظم "دی پائپنگ سانگ"
کا آزاد ترجمہ)

سرخوشی میں اپنی شہنائی کے نغمے پھونکتا
پھر رہا تھا دور رنگیلی وادیوں میں گھومتا
دیکھا اک معصوم بچہ میں نے بادل پر سوار
ہنستے ہنستے مجھ سے وہ بولا کہ سُن اے نغمہ بار

"ذکر عیسیٰ جس میں آئے ایک وہ نغمہ سُنا
اور میں فرطِ طرب میں ایک نغمہ گا گیا
پھر وہ بولا "پھر سُنا" اور انگلیاں میری چلیں
جس کو سُن کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں

"پھینک دے یہ اپنی شہنائی یہ سازِ دل رُبا
اور پھر اپنے ترنم سے وہی نغمہ سُنا"
پھر وہی نغمہ ادا میں نے ترنّم سے کیا
وہ خوشی کی انتہا سے ہنستے ہنستے رو دیا

"اے مغنّی بیٹھ اِن گیتوں کی لکھ دے اک کتاب
تاکہ اِن سے ہو سکے سارا زمانہ فیض یاب
اِتنا کہہ کر وہ مری نظروں سے اوجھل ہو گیا
میں نے توڑا ایک سرکنڈا سا بالکل کھوکھلا

اور پھر میں نے تراشا ایک بھدّا سا قلم
صاف پانی کو دیا میں نے سیاہی کا جنم
اور میں نے اپنے پیارے پیارے گیتوں کو لکھا
تاکہ ہر بچہ بنے سُن کر خوشی میں پھول سا

(دہلی)

ایک سوویت قومی نغمہ

(انگریزی سے ترجمہ)

یہ محنت کشوں کا دُلارا وطن ہے کہ امن و ترقی یہاں پل رہے ہیں
ہمارا وطن ہے جہاں رہنے والے سر اُونچا کیے فخر سے چل رہے ہیں

فرازِ سرِ پاسکو سے نشیبِ وطن کی درازیِ حدِ حسیں تک
شُمالی سمندر کے ساحل سے لے کر سمرقند کی خوشنما سرزمیں تک
یہ وہ سرزمیں ہے کہ جو پاؤں رکھتے ہی بھر دیتی ہے بانکپن سا چلن میں
یہاں آدمی اس طرح گھومتا ہے چلے حکمراں جیسے بے حد وطن میں
یہاں جیتے جیتے یہ خوشیاں بچھی ہیں، یہاں ناچتی ہے سدا شادمانی
یہاں زندگانی ہے آزاد ایسے، کہ جیسے بپھرے والگا کی روانی
ہمارے جوانوں پہ اب کھل چکے ہیں علوم ترقی کے سارے خزانے
بڑی عمر والوں کی خدمت میں ہر سمت، بجتے ہیں آداب کے شادیانے

یہ محنت کشوں کا دُلارا وطن ہے کہ امن و ترقی یہاں پل رہے ہیں
ہمارا وطن ہے جہاں رہنے والے سر اونچا کئے فخر سے چل رہے ہیں

کبھی تھی ہماری جو بیکار دھرتی ہر اک چپے چپے سے آج پھل دے رہی ہے
جو صدیوں سے ویران خطے پڑے تھے، وہاں زندگی کروٹیں لے رہی ہے
زبانوں پہ ہر مرد و زن کے ہے ساتھی، مساوات کا ایک پُر فخر نعرہ
اسی کے سہارے پہ ہم سب نے مل کر ہر اک قید توڑی وطن کو ابھارا
ہمارے کشادہ وطن کی حدوں میں یہی لوگ ہیں آج جس کے سہارے
تضادوں سے بے خوف ہو کر بڑھے ہیں، ترقی کے رستے پہ ساتھی ہمارے

یہودی ہو روسی ہو یا ہو تتاری، ملائے قدم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
ہر اک کی تمنا ہے پُر امن رہ کر، یہی زندگی اور بہتر بنا لے
یہ محنت کشوں کا دُلارا وطن ہے کہ امن و ترقی یہاں پل رہے ہیں
ہمارا وطن ہے جہاں رہنے والے سر اونچا کئے فخر سے چل رہے ہیں

ہمارا وطن روز و شب کھلکھلاتا ترقی کی جانب بڑھا جا رہا ہے
منوّر ہے یوں آنے والا زمانہ، ہمارا عَلَم جیسے لہرا رہا ہے
زمیں پہ نہیں ہم سا آزاد کوئی، ستاتے نہیں ہم کو ظلموں کے سائے
ہمیں ناز ہے کہ کوئی اس جہاں میں، ہماری ہنسی اور محبت تو لائے
مگر کوئی دشمن یہ کوشش کرے کہ ہمیں اپنی طاقت سے برباد کر دے
ہمارے وطن کی حسیں وادیوں کو اگر پھونک ڈالے تباہی سے بھر دے
تو ہم اپنے دست اور بازو کی طاقت کو ہرگز نہ اک پل بھی آرام دیں گے
بجو "یا گرتی ہوئی بجلیوں کی طرح موت کا اُس کو پیغام دیں گے

یہ محنت کشوں کا دُلارا وطن کہ امن و ترقی یہاں پل رہے ہیں
ہمارا وطن ہے جہاں رہنے والے سر اونچا کئے فخر سے چل رہے ہیں

(دہلی)

آؤ ہم انجمن سے اُٹھ جائیں

میرے گیتوں کی بے زباں سطریں
آج تم سے خطاب کرتی ہیں
مہرباں دوستوں کی محفل سے
باادب اجتناب کرتی ہیں

بات جو ہے تمہارے کانوں کی
اُس کو جگ میں اُچھال دوں کیسے
نثر میں جس کا راز پنہاں ہو
اُس کو گیتوں میں ڈھال دوں کیسے

اور یہ گیت ایسے ہوتے ہیں
محفلوں میں جو آ نہیں سکتے

دل جو چاہے تو گا بھی سکتا ہے
ہونٹ چاہیں تو گا نہیں سکتے

ایسے گیتوں کے گائے جانے پر
درد کروٹ بدلنے لگتے ہیں
سانس کی آنچ تیز ہوتی ہے
سینکڑوں دل پگھلنے لگتے ہیں

اس سے پہلے کہ انجمن اُٹھے
آؤ ہم انجمن سے اُٹھ جائیں
عمر بھر ایسی محفلیں جانے
پھر کبھی آئیں یا کس گھڑی آئیں

آؤ ان محفلوں سے دور کہیں
ایک ایسا کوئی مقام چنیں

دو گھڑی تخیلے کے دامن میں
دو دھڑکتے دلوں کی بات سنیں

میرے گیتوں کی بے زباں سطریں
آج تم سے خطاب کرتی ہیں
مہرباں دوستوں کی محفل سے
باادب اجتناب کرتی ہیں
(رام لعل؟)

خراج

تیرہ[ط] اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا

کیونکہ ستلج کے کناروں پہ ابھی باقی ہیں
میری خاموش محبت کی اُمیدوں کے مزار
میری مایوس تمناؤں کے مٹتے سے نشاں
میرے ارمانوں کے ویران سے اُجڑے سے دیار

تیرہ اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا

بہتے ستلج کے کناروں کے بیابان ابھی
میرے آنے کی وہاں آس لگائے بیٹھے ہیں

ط ویساکھی کا تہوار

تیری لہروں میں ڈوبے ہوئے ساحل اب تک
میری الفت کے کئی راز لئے بیٹھے ہیں

تیرہ اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا
اُن سسکتی سی ہواؤں کو دلاسہ دینے
جو مجھے ڈھونڈتی صحراؤں میں چلی جاتی ہیں
اور اُن بہکی ہوئی لہروں سے ملنے کے لئے
جو مجھے دیکھنے ساحل پہ چلی آتی ہیں

تیرہ اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا
تھا یہی روزِ مقدس کہ لبِ ستلج پر
ہم نے اُلفت کی قسم نظروں میں کھائی تھی کبھی
میں نے دل دے کے اُسے ایک ہنسی لے لی تھی
وہ ہنسی جو مرے سینے میں ہے محفوظ ابھی

تیرہ اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا

اُس سے کہنے کے لیے صبر کا دامن تھامو
مانا کہ عشق کے اک نشے سے مخمور رہتے ہم
اس جدائی میں ہماری کوئی لغزش ہی نہیں
مُستبد وقت کے ہر جبر سے مجبور رہے ہم

تیرہ اپریل کو میں اپنے وطن جاؤں گا

اپنی چھینی ہوئی ورثا کی زیارت کے لئے
پوچھنے کے لئے غم گین طبیعت کا مزاج
نذر کرنے کے لئے چند اُمنڈتے ہوئے اشک
ہائے یہ اشکِ محبت مرا سالانہ خراج

(احمد پور شرقیہ، پاکستان)

بیزاری

نگاہوں میں ذوقِ تجسّس سنبھالے
تجھے پیاری درشایئں کیوں ڈھونڈتا ہوں؟
لیے ذہن میں یادِ بیتے دنوں کی
محبّت کے ماتھے کو کیوں چومتا ہوں؟

وہ محبوب رستے، وہ مانوس گلیاں
ابھی تک کسی فکر میں کھو رہی ہیں
یہ افسردہ آہیں، یہ بہکی نگاہیں
کسے یاد کرتی ہیں کیوں رو رہی ہیں؟

یہ چاند اور ستارے مجھے کہہ رہے ہیں
"کہاں جا بسی تیرے خوابوں کی رانی؟"

نگاہوں سے اب دور کیوں جا بسی ہے؟
وہ خاموش، معصوم، بھولی جوانی؟

مجھے اس کا وہم و گماں تک نہیں ہے
کہ دل تیرا دولت کا قائل ہوا ہے
سنہرا یا ترا نقرئی جسم اور پھر
زر بے ثباتی پہ مائل ہوا ہے

مجھے اب کسی شے کی حاجت نہیں ہے
تو محفوظ ہے میرے دل میں نظر میں
عبث ہیں وہ ویران و بے جان گلیاں
نہیں اب کوئی دلکشی رہگزر میں

(بہاولپور، پاکستان)

انتظار

تمہاری یاد اب سینے میں آہیں بن کے آتی ہے
اُمیدیں سر بسجدہ ہیں، تمنا تھرتھراتی ہے
چلی آؤ، چلی آؤ، تمہاری راہ تکتے ہیں

پرندوں کی ترنم ریزیوں سے گونجتے جنگل
عروسِ صبح کے زرتار لہراتے ہوئے آنچل
یہ پیلے پیلے سے کھیتوں کے افسوں خیز نظارے
بھڑکتی دھوپ کے صحرا پہ آتش بار فوارے
کرنج[۵] کے دامنوں میں تنگ سی مڑتی ہوئی راہیں
یہ گورستان کی پگڈنڈیوں کی رتیلی باہیں
شبِ مہتاب میں ہر سمت پھیلی چاندنی چادرے
یہ خود رو پھول، کانٹے، وسعتِ جنگل کے شہزادے

---

۵ ایک قسم کا درخت

یہ پیروں کے نشانوں سے مزین ریت کے میداں
فضاؤں میں دھوئیں کے بادلوں کے جھنڈ پُرافشاں
یہ میری کیف زا پنگھٹ سے ٹکراتی ہوئی نظریں
یہ بَل کھاتے ہوئے رستوں میں بَل کھاتی ہوئی نظریں

غرض بستی کا ہر ذرّہ تمھاری راہ تکتا ہے
مرے سینہ میں ارمانوں بھرا اک دل دھڑکتا ہے
چلی آؤ، چلی آؤ، تمھاری راہ تکتے ہیں

(چودھری پاکستانی)

کارواں حسینوں کے

شام کا یہ سہانا سہانا سماں !
شاہراہوں پہ یہ زندگی کے نشاں
قافلے ہیں حسینوں کے ایسے رواں
راج ہنسوں کی جیسے چلیں ٹولیاں
سانس گھیرے ہوئے پیچ اٹھی زباں
وہ چلا کارواں، وہ چلا کارواں

ادھ کھلی چوٹیوں کو اچھالے ہوئے
چٹکیوں میں غرارے سنبھالے ہوئے
قہقہے وہ فضاؤں میں لگنے لگے
یک بیک لیزیم جیسے بجنے لگے
برق رفتار ہیں اُن کی سرگوشیاں
جس طرح گھنگروؤں کی وہی تالیاں
وہ چلا کارواں، وہ چلا کارواں

وہ لبوں کے اُفق پر ہنسی جو جھکی
ہر خوشی درد کی حد پہ آکے رُکی
ہونٹ گر ایک لمحے کو وا ہو گئے
دھرتی آکاش ہم سے جدا ہو گئے
ابرؤوں کے تلے تیرتی بجلیاں
دل کی دنیا سے اٹھنے نہ پایا دھواں
وہ چلا کارواں، وہ چلا کارواں

اُن کے کانوں کے زیور جھپکتے کہیں
کچھ نئے چاند تارے دمکتے کہیں
بندیوں نے وہ چہرے چراغاں کیے
مندروں کی منڈیروں پہ جیسے دیئے
ناچتی سی وہ کافر ادا بالیاں
دے رہی ہیں انھیں تھپکیاں لوریاں
وہ چلا کارواں وہ چلا کارواں

ریستورانوں میں کیفوں میں ہنسی تیز تیز
پیپسیوں کی حسیں جوڑیاں جلوہ گر
سگرٹوں کے دھوئیں دائروں میں گھلے
کنگنوں کے سہانے فضائیں گھلے
بندھ گیا چار سُو دوستی کا سماں
چھڑ گئی ہر طرف پیار کی داستاں
وہ چلا کارواں، وہ چلا کارواں

کوئی کب تک کسی کی کہانی کہے
لے کے دل میں غموں کی نشانی کہے
ہاتھ پھیلائے تنہا سرِ رہ گزر
ڈھونڈتا ہوں کہاں ہے مری ہم سفر
روح میں درد دیتا ہے انگڑائیاں
سانپ بن کر لپٹتی ہیں تنہائیاں

روھلی

مکتوب شملہ سے واپسی پر

تمھیں ہوں وطن کی بہاریں مبارک
مہکتی ہوئی رہ گزاریں مبارک
میں اوقاتِ رفتہ کو دُہرا رہا ہوں
حسیں جُھرمٹوں میں گھرا جا رہا ہوں

تمھیں یاد ہیں کوہساروں کے منظر؟
بسیط و حسیں سبزہ زاروں کے منظر؟
تمھیں یاد ہیں سازِ باراں کی تانیں؟
زمیں آسماں، چاند تاروں کے منظر؟
تمھیں یاد ہیں سردِ جھونکوں کے نغمے؟
محبت میں بیتی بہاروں کے منظر؟
تمھیں یاد ہیں رنگ و بو وادیوں کی؟
وہاں جھولتی شاخساروں کے منظر؟

تمھیں یاد ہیں وہ زمیں آسماں کے
اُلجھتے سلجھتے کناروں کے منظر ؟
تمھیں یاد ہیں کُھردرے پتّھروں سے
برستے ہوئے آبشاروں کے منظر ؟
تمھیں یاد ہیں اپنی خندہ زنی پر
مرے آنسوؤں کی قطاروں کے منظر ؟

تمھیں یاد ہیں گروہ تاروں کی شامیں
مُعطّر صبا اور وہ شبنم کی صبحیں
تو اے جانِ من اے شمیمِ مُحبّت
تو پھر سے بسا دے حریمِ مُحبّت

(احمد پور شرقیہ)

وہ تم نہیں تھیں ۔ ۔ ۔

وہ تم نہیں تھیں مری جاں حسین جلووں میں
مرے لئے وہ المناک حادثہ ہی تو تھا
جو مجھ کو چھوڑ گیا غم کے ریگزاروں میں
تمھاری حسن و جوانی کا قافلہ ہی تو تھا

محبتوں کے دھندلکوں بھرے افق سے پرے
ابھی تلک ہے نمایاں وہ کاروانِ جمیل
فسردہ آہوں کے سہمے ہوئے بگولوں میں
سنائی دیتی ہے اب تک مجھے وہ بانگِ رحیل

ہماری دنیا پہ اک خواب بن کے آئے تھے
وہ ماہتاب، وہ تارے، وہ چاندنی راتیں
الم کے تلخ سرابوں میں کھو گئیں آخر
وہ صبح و شام کے دامن میں پیار کی باتیں

یہ نامرادیٔ الفت کی مصلحت اس میں
کہ عہدِ رفتہ کو بھولے سے یاد تک نہ کریں
اگر سرشک امڈ آئیں اُن کو پی جائیں
جو یاد آئے کوئی غم تو آہ تک نہ بھریں

مرے اجڑتے خیالوں میں بارہا آکر
غمِ خموشی کے زخموں کو تم ہرا نہ کرو

جو بن کے مٹ بھی چکے، اُن تفکرات کا رنگ
مرے سکوت کے خاکوں میں تم بھرا نہ کرو

اُجڑ چکا ہے گلستاں، وہ جا رہی ہے بہار
خزاں کی عشرت مری عمر کا سہارا ہے
مگر یہ عزم تو اب نقشِ کالحجر ہے ندیم
یہ دل تمہارا ہے، واللہ دل تمہارا ہے

(بہاول پور)

وہ زمانہ

اے میرے خیالوں کی مرکز تجھ کو وہ زمانہ یاد بھی ہے
اُلفت میں وہ کیف و مستی کا مسرور زمانہ یاد بھی ہے
چھیڑا تھا دلوں کی دھڑکن پر تجھ کو وہ ترانہ یاد بھی ہے
ہم جس کو مکمل کر نہ سکے تجھ کو وہ فسانہ یاد بھی ہے
اے میرے خیالوں کی مرکز تجھ کو وہ زمانہ یاد بھی ہے

اجرام فلک کے سازوں پر جب رات کی دیوی گاتی تھی
نظروں سے تری اے رشکِ قمر جب میری نظر ٹکراتی تھی
آنکھوں میں محبت کھیلی تھی، ہونٹوں پہ ہنسی کچھ آتی تھی
اے میرے خیالوں کی مرکز تجھ کو وہ زمانہ یاد بھی ہے

کیا چیز نمایاں تھی تیری آنکھوں کی نشیلی چھایوں میں
تنویر نہ جانے کیا رخشاں تھی اِن آبی قندیلوں میں
دل جس کے لئے اُلجھا ہی رہا، تفسیروں میں تاویلوں میں
اے میرے خیالوں کی مرکز تجھ کو وہ زمانہ یاد بھی ہے

ستلج کی وہ لہریں اب تک بھی کچھ باتیں یاد دلاتی ہیں
محرم ساحل، رقصاں لہریں اک بھولا راگ سناتی ہیں
مانوس ترانے سن سن کر میری آنکھیں بھر آتی ہیں
اے میرے خیالوں کی مرکز تجھ کو وہ زمانہ یاد بھی ہے

کیا بھول گئیں وہ زنجیریں اُلفت کی رسیلی باتوں کی
وہ شرمیلی سی کچھ قسمیں، ماضی میں چھپی برساتوں کی
پُرنور سویروں کا مکھڑا، بھرپور جوانی راتوں کی
اے میرے خیالوں کی مرکز تجھ کو وہ زمانہ یاد بھی ہے

آزاد لبِ ستلج اب بھی بے چین نگاہیں آتی ہیں
اشکوں سے دھندلی ہو ہو کر مایوس نگاہیں پلٹی ہیں
پانے کو یہ اک فردوسِ نظر جانے یہ کہاں کھو جاتی ہیں
اے میرے خیالوں کی مرکز تجھ کو وہ زمانہ یاد بھی ہے

(احمد پور شرقیہ، پاکستان)

احساسِ تنہائی

غربت میں یہ غمگین مہاجر کی بساکھی
کیوں یاد دلاتی ہے وہ جنی کے نظارے

وہ جھولوں کی شاخیں چیرتے وہ تیز سفینے
نغموں کی طرح بہتے ہوئے نرم سے دھارے

ستلج کے کناروں پہ کہیں دھانی دوپٹے
وہ شوخ لبادوں میں کہیں چاند ستارے

وہ نور کے سانچوں میں ڈھلے نقرئی اجسام
کاندھوں پہ رکھے سرمئی آنچل کے کنارے

راہوں میں کہیں حسن و جوانی کے تقابل
سائے میں کہیں پیڑوں کے نازک سے اشارے

گو آج بھی زوروں پہ تھا ہنگامۂ بیساکھ
پھر بھی کسی دوشیزہ کے اندوہ کے ناتے

دن بھر مری آنکھوں میں اُبلتے رہے آنسو
ٹکراتے رہے ذہن سے شانچ کے کنارے

(راتھرس)

شفق ریزے

چودھری کے ایک گوشہ میں کہیں کھیتوں کے بیچ
چل رہا ہے ایک رُولا اس طرح سے وقتِ شام
جیسے اک الھڑ سی بیوہ آنکھ میں آنسو لئے
اپنے شوہر کے تصوّر سے ہو رہ کر ہم کلام

مُلگجے سے بادلوں کی ٹوٹتی صف کے تلے
دُور اک رنگین بدلی گرم ہے رفتار میں
جا رہی ہو جیسے بستی کی طرف ننگے قدم
ایک دیہاتی حسینہ سایۂ اشجار میں

سُرخ پھولوں سے لدی ہیں اس طرح کھیتوں کے پاس
راستوں کے حاشیوں پہ سبز سی جھاڑیاں
جیسے نو وارد کی آمد سے ٹھٹھک کر رقص میں
روک لیں اپنے قدم دیہات کی دوشیزگاں

مسرت جہاں رقص فرما رہی تھی
وہاں دورِ رنج و الم چل رہا ہے
کبھی جس میں تھی اک پتنگے کی جرأت
وہ دل شمع کی طرح سے جل رہا ہے

وہ گھڑی جب بکی زیست میری آئی
صورتِ واردات آئی ہے
ہر مسافر جو کہہ نہیں سکتا
لب پہ میرے وہ بات آئی ہے

جو بھی راہی ادھر سے گزرا ہے
اُس کو رستے میں رات آئی ہے

بچ گئے جو نگاہِ اوّل میں
بیشتر اشک بن کے ڈھلتے ہیں
ہجر میں ان سہل پسندوں کے
ولولوں کے بھی پنکھ جلتے ہیں
لیکن اے دوست! دل کے چھلے ہوئے
مدتوں دھڑکنوں میں پلتے ہیں

وہ ادائیں میں یوں گریزاں تھے
ہم سمجھتے تھے دوستی کم ہے
اب تو ملتے ہی ہاتھ ملتے ہیں
اپنی قسمت کا اب یہ عالم ہے

ہاتھ بھی ہو گئے ہیں بے معنی
اب تو دو حرفوں کا ایک سنگم ہے

دیوتاؤں کے زُہد ڈوب گئے
تیری دو آتشہ نگاہوں میں
تیرے دَردان کے تمنّائی
آج شاپٹ[1] پڑے ہیں راہوں میں
تیری مُسکان ہے مسیحائی
زندگی کے سبھی گُناہوں میں

رات ہے اور نشیبِ راہ بھی ہے
نیلگوں بجلیاں چمکتی ہیں

۱؎ بددعا کے مارے ہوئے۔

جب کبھی تیری سے میں گزرتا ہوں
زیر و بم میں یہ ایسی لگتی ہیں
جس طرح بوندیاں پسینے کی
تیری زلفوں میں آ لرزتی ہیں

صبح کی دیوی کبھی کی لے چکی انگڑائیاں
روشنی میں گھل گئی ہے اونگھتے تاروں کی چھاؤں
جادۂ عشاق[1] سے کچھ دور آگے اس طرح
دامنِ کہسار میں ہے منظرِ راجندر گاؤں[2]
جیسے زندہ ہو گئی ہیں پھر روایاتِ کہن
پہلوئے عزیت میں سوئی ہے اک سیمیں بدن

---

[1] لورینر لین

[2] راجندر نگر، نئی دہلی

آج ہیں ڈلّی پہ خیمہ زن سفیرِ برشگال
اور ذرا جندر نگر میں نغمہ زن ہے نے فروش
رُوح سے ٹکرا رہی ہے اس طرح بنسی کی گونج
قلب مضطر ہو چلا ہے غافلِ فرداودوش
جس طرح ورشا تصور پہ مرے چھائے ہوئے
مسکراتی، گنگناتی، بال بکھرائے ہوئے

چاندنی رات میں لہروں کی سہانی آواز
چاند کے پانی میں ہونے کا پتا دیتی ہے
جیسے بڑھتی ہوئی لہروں کو کوئی زُہرہ جبیں
جنبشِ دستِ حنائی سے ہٹا دیتی ہے

رات مصروفِ ترنّم تھی کوئی زُہرہ جبیں
سوز کے ساتھ روانی میں تھی اشکوں کی قطار
جیسے دیپک کے سُروں پہ کوئی گانے والا
چھیڑ دے ڈوب کے نغمات کے طوفاں میں ملار

رات اک زُہرہ جبیں نے جو اُٹھائیں پلکیں
آنکھ سے اشک کے دامن کا سرا چھوٹ گیا
جیسے جُگنو کوئی جنّت سے گرا ہے تھک کر
یا کسی حور کی چوڑی کا بٹن ٹوٹ گیا

چشمِ پُر اشک سے دیکھا جو دریچہ کی طرف
ایک خاموش سی بے حِس تھی وہاں زُہرہ جبیں
جیسے مرمر کے کسی بُت نے اُچک کر نیچے
عکس پہچانا ہو تالاب کے پانی میں کہیں

دفعتاً بجھ گیا اک سانس سے اُس وقت چراغ
کر رہی تھی وہ سرِ شام جو ہنس ہنس کے سنگار
جیسے بر بط پہ کسی مطرب نَو کی مضراب
ایک لغزش سے کئی توڑ دے بجتے ہوئے تار

رُبع مسکوں کے ہر اک چپے کی میں نے کی ہے سیر
دیکھنے کو پیروانِ ابنِ مریم کا وجود
مجھ کو لیکن دو عدد سچے کلیسائی ملے
ایک تھا اُن میں مسلماں ایک از اہلِ یہود

(ترجمہ)

شکل دیتی ہے فریب آغاز سے
مجھ کو پہچانو مری آواز سے
بھولنے والے ندامت کس لئے
میں اسی قابل تھا انداز سے

متفرقات

بحرِ الفت میں کئی سہاروں پہ
ڈوبنے والے تیر جاتے ہیں
میری آنکھیں غموں کے طوفاں میں
دو دیئے ہیں کہ جھلملاتے ہیں

یوں میری نگہہ فریب خوردہ حسین جلووں میں بھر رہی ہے
کہ جیسے کوئی جواں مسافر بچھڑ کے بھٹکا ہو قافلے سے

نگاہِ ناز کو میری نظر سے کھیل لینے دو
کہ اس نشتر کو پھر زخمِ جگر سے کھیل لینے دو
تلاطم دیکھنا چاہو تو کچھ آئینہ رو ہو کر
ذرا اپنی نظر اپنی نظر سے کھیل لینے دو

وہ حکومت جس کو حاصل ہو عوامی اشتراک
وہ حکومت چہرۂ ہستی سے مٹ سکتی نہیں
(ابراہیم لنکن)

اگر کہیں ہے غریبی ہماری دُنیا میں
وہ ساری دُنیا کی خوشحالیوں کا خطرہ ہے
(گاندھی)

فاقہ کشوں کے سامنے آیا اگر خُدا
آئے گا بالیقین وہ روٹی کی شکل میں
(گاندھی)

ناداں ہیں پر کہتے ہیں جو اقسام حکومت
عمدہ ہے وہی نظم و نسق جس کا ہے بہتر
(الیگزنڈر پوپ)

غمِ رفیع

(تاریخِ وفات ۱۴۰۰ ہجری)

م۔ موت کے بے درد و ظالم ہاتھ نے اک بار پھر
ح۔ حیف اپنا وار دُہرایا کچھ اس انداز سے
م۔ محفلِ سنگیت بیٹھی تھی عزادارِ غمکیش
د۔ دم زدن میں لُٹ گئی یہ ایک آواز سے
ر۔ راہِ موسیقی پہ اُس کے بعد آئیں گے کئی
ف۔ فن کی صہبا گھول کر سنگیت میں لائے گا کون؟
ی۔ یاس کے ماحول میں بھرنے کو اک رنگِ نشاط
ع۔ عرشِ موسیقی سے تازہ نغمے برسائے گا کون؟

محمد رفیع

(رمیش)